پیغمبر اکرم ﷺ کی رحمت اور شدّت کے نمونے قرآنِ کریم کی روشنی میں

سید عقیل حیدر زیدی (مشہد مقدس)
aqeel.zaidi1968@gmail.com

کلیدی کلمات: رحمت، شدّت، اُسوۂ حسنہ، معاشرتی اخلاق

خلاصہ

اس مقالے میں قرآنِ کریم کی روشنی میں پیغمبرِ اکرم ﷺ کی رحمت اور شدّت کے بارے میں جستجو اور تحقیق کی کوشش کی گئی ہے، اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ مثبت اور منفی نمونہ ہائے عمل اور اُسوہ ہائے حسنہ نکال کر پیش کئے جائیں تاکہ انسانوں کی سیر و سلوک اور راہ و رفتار کو، گزشتہ تاریخی ادوار میں بشری اور آسمانی مکاتب و مذاہب کی ارزشمند اوصاف اور گھٹیا و پست صفات کے تناظر میں، مختلف اور متناسب نمونہ ہائے عمل پیش کرنے کے ساتھ جہت و سمت دی جاسکے۔

ہم قرآنی آیات سے الہام لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دینِ اسلام نے انسانوں کی اسی روحانی ضرورت کے پیشِ نظر بہترین الٰہی اور انسانی نمونے اور اُسوہ ہائے حسنہ پیش کئے ہیں اور پیغمبرانِ الٰہی، بالخصوص اُن میں سے دو شخصیات، حضرت ابراہیمعلیہ السلام اور حضرت رسول اکرم ﷺ کی بہترین بشری و انسانی نمونے کے عنوان سے شناخت کروائی ہے۔ قرآنِ کریم حضرت محمد ﷺ کا ایک کلّی اور اجمالی وصف میں صاحبِ رحمت اور شدّت و صلابت کے عنوان سے تعارف کرواتا ہے اور یہ دونوں صفات کلامِ وحی الٰہی (قرآنِ کریم) کی نگاہ سے، رسولِ اعظم ﷺ کے اجتماعی اور معاشرتی اخلاق کے اہم ترین پہلوؤں میں سے شمار ہوتی ہیں۔

مقدمہ

اس مقالے میں قرآنِ کریم کی روشنی میں پیغمبرِ اکرم ﷺ کی رحمت اور شدّت کے بارے میں جستجو اور تحقیق کی کوشش کی گئی ہے، اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ مثبت اور منفی نمونہ ہائے عمل اور اُسوہ ہائے حسنہ نکال کر پیش کیے جائیں تاکہ انسانوں کی سیر و سلوک اور راہ و رفتار کو، گزشتہ تاریخی ادوار میں بشری اور آسمانی مکاتب و مذاہب کی ارزشمند اوصاف اور گھٹیا و پست صفات کے تناظر میں، مختلف اور متناسب نمونہ ہائے عمل پیش کرنے کے ساتھ جہت و سمت دی جاسکے۔

ہم قرآنی آیات سے الہام لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دینِ اسلام نے انسانوں کی اسی روحانی ضرورت کے پیشِ نظر بہترین الٰہی اور انسانی نمونے اور اُسوہ ہائے حسنہ پیش کیے ہیں اور پیغمبرانِ الٰہی، بالخصوص اُن میں سے دو شخصیات، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت رسول اکرم ﷺ کی بہترین بشری و انسانی نمونے کے عنوان سے شناخت کروائی ہے۔ قرآنِ کریم حضرت محمد ﷺ کا ایک کلّی اور اجمالی وصف میں صاحبِ رحمت اور شدّت و صلابت کے عنوان سے تعارف کرواتا ہے اور یہ دونوں صفات کلامِ وحی الٰہی (قرآنِ کریم) کی نگاہ سے، رسولِ اعظم ﷺ کے اجتماعی اور معاشرتی اخلاق کے اہم ترین پہلوؤں میں سے شمار ہوتی ہیں۔

ا۔ قرآن اور بہترین انسانی نمونہ ہائے عمل

تمام زمینی و الٰہی مکاتب و مذاہب، اپنے مطلوب اور منظورِ نظر انسان کی تربیت کے لیے اور نیز بشر کے فطری اور سرشتی تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے، مناسب نمونہ ہائے عمل اور اسوہ ہائے حسنہ، اپنی ارزشمند اور پست و گھٹیا صفات کے تناظر میں پیش کرتے ہیں اور اپنے پیروکاروں کو اُن کی پیروی کرنے اور اُن جیسا بننے کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ دینِ مبینِ اسلام بھی، تشریعی اور شرعی قانون گزاری سے کہیں زیادہ، موضوعِ اخلاق اور اُس کی ارزشمند تعلیمات کی تبیین و تشریح کے لیے، اپنی کتابِ وحی (قرآنِ کریم) کی ایک چوتھائی (1/4) یعنی تقریباً ایک ہزار پانچ سو آیات میں، فضائلِ اخلاقی سے آراستہ انسانوں کی تربیت کرنے کو پیغمبرانِ الٰہیؑ، خصوصاً پیغمبرِ خاتم ﷺ کی بعثت کے اہداف اور مقاصد کے طور پر بیان کرتا ہے:

"هُوَالَّذِی بَعَثَ فِی الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"

ترجمہ: "خدا وہ ہے جس نے مکہ والوں میں خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتا، ان کے نفوس کو پاکیزہ بناتا اور انہیں کتاب (قرآن) و حکمت کی تعلیم دیتا ہے" (1)

اس سب کے علاوہ، اسلام اپنے مطلوب اور موردِ پسند عملی نمونوں کے لیے عینی مشاہدے اور محسوس طور پر ایسے انسانوں کا تعارف کراتا ہے، جو بشری اور زمینی خواہشات اور تمایلات رکھنے کے باوجود، اپنے اپنے زمانے کے انسانیت کے بلند و بالا اور اسلام و قرآن کے دل خواہ درجات پر فائز تھے۔ قرآنِ کریم نے اِن عملی نمونوں کے اخلاق، اِن کی صفات اور راہ و روش کا مطالعہ کرنے اور آئیڈیل کے طور پر انتخاب کرنے کی تاکید اور سفارش کی ہے:

"وَاذْكُرْ فِی الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا۔" (2)

ترجمہ: "اور اِس کتابِ خدا میں ابراہیم کا تذکرہ کرو کہ وہ ایک بہت سچے پیغمبر (خدا) تھے۔"

"وَاذْكُرْ فِی الْكِتَابِ مُوسَى إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا۔" (3)

ترجمہ: "اور اس کتاب (آسمانی) میں موسیٰ کا بھی تذکرہ کرو کہ وہ میرے مخلص (بندے) اور رسول و نبی تھے۔"

"وَاذْكُرْ فِی الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا۔" (4)

ترجمہ: "اور اس کتابِ الٰہی میں اسماعیل کا تذکرہ کرو کہ وہ وعدے کے سچّے اور ہمارے بھیجے ہوئے پیغمبر اور نبی تھے۔"

"وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ۔" (5)

ترجمہ: "اور اے پیغمبر ﷺ! ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا ذکر کیجئے، جو صاحبانِ قوت اور صاحبانِ بصیرت تھے۔"

"وَاذْكُرْ إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِنَ الْأَخْيَارِ۔" (6)

ترجمہ: "اور اسماعیل، الیسع اور ذوالکفل کو بھی یاد کیجئے اور یہ سب نیک بندے تھے۔"

"وَاذْكُرْ فِی الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا۔" (7)

ترجمہ: "اور کتابِ خدا میں ادریس کا بھی تذکرہ کرو کہ وہ بہت زیادہ سچے پیغمبر تھے۔"

''وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ۔'' (8)

ترجمہ: ''آپؐ ان کی باتوں پر صبر کریں اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کریں جو صاحبِ طاقت تھے۔''

''وَاذْکُرْ عَبْدَنَا اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطَانُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ۔'' (9)

ترجمہ: ''اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ شیطان نے مجھے بڑی تکلیف اور اذیت پہنچائی ہے۔''

اِن آیاتِ مبارکہ میں پیغمبرانِ الہیؑ اور انسانی عملی نمونوں کے نام زندہ رکھنے کے دستور کے ضمن میں اُن کے پسندیدہ اوصاف میں سے کوئی ایک وصف اور فضائل میں سے کوئی ایک فضیلت بیان کی گئی ہے تاکہ اُن کی یاد زندہ اور باقی رکھنے کی حکمت کو ذہن نشین کروائے۔

۲۔ رسولِ اعظم ﷺ بہترین اسوۂ قرآنی

دسیوں انسانی نمونوں اور اسوہ ہائے عمل کی شائستہ برگزیدہ ہستیوں کے درمیان سے، جن میں سے بعض کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، قرانِ کریم دو افراد کو صراحت کے ساتھ بہترین اُسوہ اور نمونۂ عمل کے طور پر معرّفی کرتا ہے، ایک ابراہیمؑ اور دوسرے محمد ﷺ۔

ا۔''قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْ اِبْرَاهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَآؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ...'' (10)

ترجمہ: ''تمہارے لئے بہترین نمونۂ عمل ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں ہے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے غیرِ خدا معبودوں سے بیزار ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کر دیا ہے اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کی عداوت اور دشمنی ہے یہاں تک کہ تم خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان لے آؤ۔۔۔''

۲۔''لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰهَ کَثِیْرًا۔''

ترجمہ: ''یقیناً تم میں سے اس شخص کے لئے رسولِ خدا ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے، جو بھی اللہ اور آخرت سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے۔'' (11)

اِن دو آیات مبارکہ کی بیانی روش اور معنی میں غور و فکر اور دقّت کرنے سے یہ مطلب آشکارا ہوتا ہے کہ اِن دونوں آیات کے اسلوب میں اختلاف اور تفاوت میں سے یہ ہے کہ ایک تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بطورِ نمونۂ عمل تعارف کرواتے ہوئے قرآنِ کریم اُن کا موحّد و خدا پرست ہونا اور اپنے نزدیک ترین مشرک رشتہ داروں سے (شرک کی وجہ سے) برائت کا اظہار کرنا، زیادہ موردِ تاکید واقع ہوا ہے، علاوہ ازیں یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لے کر تذکرہ کیا ہے، جبکہ پیغمبر اکرم ﷺ کا نمونۂ عمل کے عنوان سے تعارف کرواتے وقت، آنحضرت ﷺ کی خداوند متعال کی طرف سے رسالت اور بعثت کی تصریح کی گئی ہے اور نیز آپؐ کے نمونۂ عمل اور آئیڈیل ہونے کو، آپؐ کی خصلتوں، صفات و اوصاف اور راہ رفتار کے کسی خاص اور معیّن پہلو کے ساتھ مقیّد اور محدود نہیں کیا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ پیغمبرِ عظیم الشانِ اسلام ﷺ کی رسالت و نبوّت کا ایک پہلو، آپؐ کا لوگوں کے لیے نمونۂ عمل اور اُسوہ حسنہ ہونا بھی ہے اور کیونکہ آپؐ کی رسالت، خاتمِ رسالت اور جہان کے تمام لوگوں کے لیے ہے، اس لیے خداوند متعال آپؐ کو سب لوگوں کے لیے، تمام زمانوں اور تمام مکانوں میں پیروی اور اقتداء کے لیے بہترین اور سزاوار ترین فرد سمجھتا ہے، بغیر اس کے کہ آپؐ کی زندگی کا کوئی خاص پہلو، دوسرے پہلوؤں کی نسبت اس بارے میں بہت زیادہ درخشندگی یا بہت کم شائستگی اور صلاحیت کا حامل ہو۔(12)

اگرچہ یہ آیتِ شریفہ، جنگِ احزاب کی آیات کے سیاق میں واقع ہوئی ہے، لیکن آیت کا اطلاق اور بیانِ عام یہ ظاہر کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اُسوہ اور نمونۂ عمل ہونا، فقط جنگ میں طرزِ رہبری اور فنونِ سپہ سالاری کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اسی وجہ سے مفسّرین اور قرآنی محقّقین نے اگرچہ اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں دو احتمال ذکر کئے ہیں، لیکن اُنہوں نے عام معنی کا ہی انتخاب کیا ہے، جیساکہ زمخشری (متوفی ۵۲۸ق) کی تفسیرِ کشّاف میں آیا ہے:

"پیغمبرِ اکرم ﷺ بذاتِ خود (تمام پہلوؤں میں) اُسوۂ حسنہ، آئیڈیل اور نمونۂ عمل ہیں۔"(13)

اس پر اضافہ یہ کہ اس آیتِ شریفہ کی اَدبی شکل و صورت اور الفاظ کی ترتیب و استعمال میں چند نکات قابلِ ملاحظہ ہیں، جو رسولِ خدا ﷺ کی ہمہ گیر شخصیت سے اور خداوند متعال کے اس سیرتِ اخلاقی پیغمبرؐ کو

واضح اور نمایاں کرنے پر اصرار اور مؤمنین کو آنحضرتؐ کی سیرت کے اپنانے کی ترغیب کی اہمیت اور تاکید کو ظاہر کرتے ہیں:

۱۔ آیتِ شریفہ نے اپنے ابتدائی الفاظ میں ''لام'' اور ''قد'' کے دو حروف سے استفادہ کیا ہے اور یہ دونوں الفاظ، ادبیاتِ عرب میں اپنے بعد کے مطلب کے حتمی اور قطعی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ پس جب یہ دونوں الفاظ ایک ساتھ (لقد) استعمال کئے جائیں، تو قطعی اور حتمی ہونا دو برابر ہو جاتا ہے؛ یعنی پیغمبر اکرم ﷺ کا اُسوہ اور نمونۂ عمل ہونا ہرگز قابلِ شک و تردید نہیں ہے، نیز یہ تاکید دو برابر ہونے کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتی ہے، اگر ہم ''لام'' کو قسم کے لیے قرار دیں۔

۲۔ لفظِ ''کان'' اپنے مفہوم میں، ثبوت، استمرار اور زمان و مکان سے ماوراء معنی رکھتا ہے اور پیغمبرِ اکرم ﷺ کا نمونۂ عمل ہونا، اس لحاظ سے کہ آنحضرتؐ کی رسالت، خاتمیت کے متقاضی ہے، ثابت و دائم اور زمان و مکان کی قید سے وسیع تر ہے؛ یعنی حیاتِ بشری کی تاریخ کے ایک خاص عصر یا خاص جغرافیا اور فرہنگ و تمدّن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔(14)

۳۔ حرفِ ''فی'' کا استعمال، جو ظرف کے ایک چیز میں مستقر اور پائیدار ہونے پر دلالت کرتا ہے،(15) اس جملے ''لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا وجودِ اقدس، خداوند متعال کے نزدیک بہترین نمونۂ عمل ہونے کا ظرف و محل، عمدہ اوصاف اور پاکیزہ فضائل سے سرشار اور تمام انسانی صفات اور خوبیوں پر احاطہ رکھتا ہے اور جس طرح ظرف مظروف کو اپنے اندر سمو لیتا ہے، اسی طرح پیغمبرِ اکرم ﷺ کے وجودِ قُدسی والٰہی نے اُن تمام فضائل اور خوبیوں کو، جن کی ایک انسان کو بہترین، عمدہ اور کامل زندگی گزارنے کے لیے ضرورت پڑتی ہے، اپنے اندر سمویا ہوا ہے اور آپؐ کی ذاتِ والا صفات ان تمام اوصاف و فضائل اور خوبیوں کا معدن، مخزن اور مقام ہے؛ انہی خوبیوں کا ایک جگہ اکٹھا ہونا (اور شاید دوسری بیانی خصوصیات کا بھی ہونا) سبب بنا کہ جار اللہ زمخشری، جو زبانِ عرب کا بلاغت و بیان شناس شخص ہے، کہتا ہے:

> ''اگر ہم آیت کے آخر تک ملاحظہ کریں تو دیکھیں گے کہ خداوند متعال نے کسی بھی تاکیدی اسلوب کو ترک نہیں کیا ہے۔''(16)

۴۔ جو الفاظ نمونۂ عمل کا معنی دیتے ہیں، اُن میں سے ایک "اُسوہ" ہے، یہ لفظ قرآن کے تعریفی الفاظ میں سے ہے اور مثبت معنی کا حامل ہے؛ یعنی نمونۂ عمل ہونے کے ساتھ ہی تعارف کروائے جانے والے شخص کی راہ و رفتار اور خصلتوں کی تائید کو بھی بیان کرتا ہے، اس لحاظ سے کہ اگر معمولی سا شک و تردید اور خدشہ بھی (کہاں یہ کہ یقین ہو) اس شخص کی راہ و رفتار، اخلاقی، روحانی اور نفسیاتی صفات کے دینی اور الٰہی ارزش مند اور بے ارزش چیزوں کے درست و صحیح ہونے کی نسبت پایا جاتا ہو تو اس کو "اُسوہ" نہیں کہتے ہیں۔

یہ چیز خداوند متعال کی جانب سے آنحضرت ﷺ کے اخلاق و صفات اور تمام راہ و رفتار کے صحیح ہونے پر بطورِ بیمہ اور ضمانت ہے اور یہی پیغمبر اکرم ﷺ کی ذاتی اور اخلاقی واقعیت ہے، جو کتابِ خدا (قرآن) اور رسولِ خدا کے درمیان (کہ ہر دو تشریعی اور تکوینی لحاظ سے انسانی ہدایت کا سرچشمہ ہیں) یکسانیت اور برابری کا تعلّق برقرار کرتی ہے، کیونکہ خداوند قرآنِ کریم کی توصیف کرتے ہوئے بھی فرماتا ہے:

"إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ۔۔۔" (17)

ترجمہ: "بیشک یہ قرآن اس راستہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔۔۔"

۳۔ رحمت اور شدّت و صلابت

رحمت اور شدّت و صلابت، جو نگاہِ ابتدائی میں دو متعارض اور ایک دوسرے سے نامناسب خصلتیں اور صفات نظر آتی ہیں، یہ دونوں پیغمبرِ عظیم الشانِ اسلام ﷺ کے اخلاق و سیرت میں دو عمدہ اور نمایاں خصوصیات کے طور پر شمار ہوتی ہیں۔

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ" (18)

ترجمہ: "اے پیغمبر ﷺ! یہ اللہ کی (برکت اور) مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے، تو یہ لوگ تمہارے پاس سے پراکندہ اور منتشر ہو جاتے، لہٰذا اب انہیں معاف کر دو۔ ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرو اور جب ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

اس آیتِ مبارکہ میں بہ یک وقت، پیغمبرِ اکرم ﷺ کا ایک طرف تو لوگوں کے ساتھ میل جول اور راہ و رفتار میں مظہرِ عطوفت، ملائم اور مہربان ہونے کے عنوان سے تعارف کرایا جاتا ہے اور یہ آیت آپؐ کی

اسی خصوصیت کو لوگوں کے آپؐ کی طرف مائل ہونے کا سبب اور مسلمانوں کے درمیان آپؐ کی محبوبیت اور قابلِ نفوذ ہونا قرار دیتی ہے اور دوسری جانب یہی آیت قاطعیت، مسالمت ناپذیری اور تصمیمات کے اجراء میں شدّت پسندی و صلابت اختیار کرنے کی آپؐ کو سفارش کرتی ہے اور اس طرح کی صفت کو خداوند متعال کی محبوب اور موردِ پسند صفت کے طور پر بیان کرتی ہے اور یہ واضح سی بات ہے کہ اگر کوئی صفت، خصلت یا راہ و رفتار خداوند متعال کی دلخواہ اور موردِ پسند ہو تو وہ اپنے پیغمبرؐ کو اس سے ضرور آراستہ فرمائے گا اور وہ اس پر عمل کرنے والا بھی ہوگا۔

رسولِ خدا ﷺ اپنی عائلی (خانوادگی)، اجتماعی اور سیاسی زندگی میں، خواہ وہ حکومتِ اسلامی کی تشکیل اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے سے پہلے کی زندگی ہو یا حکومتِ اسلامی کی تاسیس و تشکیل اور دینی و معنوی پیشوائی و راہنمائی کے ساتھ ساتھ سیاسی زعامت و رہبری حاصل کرنے کے بعد کی زندگی ہو، آپؐ مظہرِ رحمت و مہربانی اور نیز شدّت و قاطعیت کا عملی نمونہ تھے۔ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی ان دو اخلاقی خصوصیات کو واضح اور روشن تر درک کرنے کے لیے، ابتداء میں رحمت اور صلابت (شدّت) کے دونوں الفاظ کی معنوی شناخت حاصل کرتے ہیں اور پھر ان دونوں خصوصیات کی رسولِ اکرم ﷺ کے وجودِ مقدّس میں (بطورِ اجمالی) تبیین اور توضیح پیش کرتے ہیں۔

ا۔۳۔ رحمت اور رأفت

ا۔ا۔۳۔ رحمت کا مفہوم

"رحمت" لغتِ عرب میں "رقّتِ قلب اور مہربانی" کے معنیٰ میں ہے۔ ابنِ منظور "لسان العرب" میں لکھتا ہے کہ: "رحمت" "رقّت (نرمی) اور مہربانی" کرنے کے معنیٰ میں ہے۔ اور "مرحمت" بھی اسی معنیٰ میں ہے۔ جس وقت رحمت، انسانوں کی صفت کے عنوان سے استعمال ہو اور جس وقت خداوند متعال کی صفت واقع ہو تو وہاں رحمت کے معنی میں فرق کے بارے میں ابنِ منظور مزید لکھتا ہے: "عرب زبان میں جب بھی لفظِ رحمت انسانوں کے لیے استعمال ہو تو قلب کی نرمی اور مہربانی کے معنی میں ہے، لیکن رحمتِ خداوند متعال، مہربانی، احسان اور رزق دینے کے معنی میں ہے۔" (19)

"رحمت" کے قرآنِ کریم میں استعمال کو بھی اسی معنی میں سمجھتے ہیں؛ لغت دان اور قرآن شناسِ معروف "راغبِ اصفہانی" کہتا ہے: "رحمت، مہربانی اور ایسی نرمی ہے جو موردِ رحمت واقع ہونے والے شخص کی

نسبت احسان کا تقاضا کرتی ہے، اسی وجہ سے لفظِ رحمت، کبھی فقط مہربانی (یعنی ملزوم) اور کبھی فقط احسان (یعنی لازم) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: "خدا فلاں پر رحمت کرے۔" اور چنانچہ خداوند متعال رحمت کے ساتھ متصف ہو تو اس سے مراد فقط احسان ہے، نہ رقّت اور نرمی قلب، اسی بناء پر روایت میں آیا ہے کہ "رحمت" خدا کی طرف سے انعام اور لطف و کرم اور لوگوں کی طرف سے رقّتِ قلب اور عطوفت و مہربانی ہے۔" (20)

"جار اللہ زمخشری" اسی مطلب کو قبول کرنے کے ساتھ، کہ "رحمت" کا معنی اور مفہومِ اصلی "عطوفت اور مہربانی" ہے، یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس لفظ کا خداوند متعال کے لیے استعمال مجازی اور خداوند کے اپنے بندوں پر انعام و اکرام کے معنی میں ہے، جس طرح کہ حاکم اگر لوگوں پر مہربان ہو تو اُن پر احسان اور انعام و اکرام کرتا ہے۔ (21)

علّامہ سید محمّد حسین طباطبائیؒ، صاحب تفسیرِ گراں قدر "المیزان" لفظِ رحمت کے مفہوم کی مزید توضیح دیتے ہوئے کہتے ہیں: "رحمت، ایسا مخصوص اثر اور حالت ہے جو کسی محتاج کو دیکھنے کے وقت انسان کے دل کو عارض ہوتی ہے اور اُس شخص کو محتاج اور نیاز مند کی ضرورت اور نیاز برطرف کرنے پر وادار کرتی ہے۔ یہ معنی تجزیہ و تحلیل کے طور پر عطا اور فیض کی طرف بازگشت کرتا ہے اور اسی معنی میں خداوند متعال بھی رحمت کی صفت کے ساتھ متّصف ہوتا ہے، یعنی: رحمت خداوند کے لیے عطا اور احسان کے معنی میں ہے، نہ قلب کے متاثّر اور حالت تبدیل ہونے کے، کیونکہ باری تعالیٰ کی ذات میں متاثّر ہونا اور حالت کا تبدیل ہونا نہیں ہے۔" (22)

علّامہ طباطبائیؒ کی مفہومِ رحمت کی اِس وضاحت میں دو نکات قابلِ توجہ ہیں:

پہلا: انہوں نے منشاءِ رحمت (یعنی نیاز مند شخص کی احتیاج اور نیاز) کو رحمت کی تعریف اور مفہوم میں ضمیمہ کرکے، نتیجتاً مہربانی اور مخصوص رقّتِ قلب کو، جو نیاز مند کی ضرورت اور نیاز کو برطرف کرنے کی غرض سے عطا کرنے والے شخص پر عارض ہوتی ہے، رحمت کا نام دیا ہے۔

دوسرا: رحمت کا خداوند متعال کے لیے استعمال، علّامہ کی اس تعریف اور توضیح کی بنیاد پر مجاز نہیں ہے۔ جیسا ہم نے زمخشری سے نقل کیا ہے۔ خصوصاً یہ کہ قرآنِ کریم میں، رحمت کا زیادہ تر استعمال، ذاتِ باری تعالیٰ ہی کے مورد میں ہوا ہے، اگر خداوند متعال کے اِس صفت سے متّصف ہونے کو مجاز شمار کریں، تو

قرآنِ کریم میں اِس صفت کا زیادہ تر استعمال مجاز ہو جائے گا اور یہ کسی بھی دوسری چیز کے علاوہ، قرآن کی بلاغت کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ لہٰذا اس بناء پر علّامہ طباطبائیؒ کی نظر، رحمت کے معنی بارے میں، زمخشری کی رائے سے صحیح تر دیکھائی دیتی ہے۔

نتیجہ یہ کہ "رحمت" مہربانی اور نرمی و رقّت قلب کے معنی میں ہے، جو نیازمند شخص کے دیکھنے سے عارض ہوتی ہے اور انسان کو احسان کرنے پر اُبھارتی ہے؛ لیکن خداوند متعال کے لیے رحمت، احسان و انعام کے معنی میں ہے؛ اگرچہ وہ رقّتِ قلب اور حالت کے تبدیل ہونے کے ساتھ متّصف نہیں ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے ایک کلام میں بھی یہی خصوصیت، خداوند متعال کی رحمت کے ساتھ توصیف میں لحاظ ہوئی ہے، حضرتؑ نے فرمایا: "رَحِيمٌ لَا يُوصَفُ بِالرِّقَّةِ" (23) یعنی: "وہ ایسی رحمت والا ہے کہ جو رِقّتِ قلب کے ساتھ متّصف نہیں ہوتا۔"

جن قرآنی آیات میں خداوند متعال اِس صفت کے ساتھ تعریف اور ستائش کیا گیا ہے، اُن میں بھی یہی خصوصیت نظر آتی ہے۔

۲۔۱۔۳۔ رأفت کا مفہوم

لفظ "رأفت" آیاتِ قرآن میں مجموعی طور پر گیارہ بار آیا ہے، یہ لفظ دو بار "رَأْفَة" اور نو بار "رَؤُوف" کی صورت میں اور نیز "رَحِيم" کی صفت کے ساتھ، خداوند متعال کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم کے عنوان سے استعمال ہوا ہے، سوائے ایک مورد کے، جس میں رسولِ خدا ﷺ کے نفسانی اور اخلاقی حالات کے بیان کے طور پر آیا ہے۔ عرب زبان کے دانشور، سوائے راغب اصفہانی کے، جو "رأفت" کو رحمت کے مترادف سمجھتا ہے، "رأفت" اور رحمت کے درمیان مفہوماً فرق کے قائل ہیں:

"صحاح اللغة" (24)، "اقرب الموارد" (25)، تفسیرِ تبیان میں شیخ طوسیؒ، اور مجمع البیان میں علّامہ طبرسیؒ سورۂ مبارکۂ بقرہ کی آیت ۱۴۰ کے ذیل میں "رأفت" کو شدّت رحمت کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ صاحبِ قاموسِ قرآن بھی رحمتِ شدید کو رأفت کے دو معنی میں سے ایک جانتے ہیں۔ (26)

لیکن علّامہ طباطبائیؒ رأفت اور رحمت کے فرق کو مہربانی کی شدّت اور ضعف کی نظر سے نہیں، بلکہ موردِ رحمت و رأفت قرار پانے والے کی حالت اور وضعیت کے لحاظ سے سمجھتے ہیں، یعنی رحمت ہر ایک پر مہربانی کرنا ہے، لیکن رأفت کسی مصیبت میں مبتلاء اور گرفتار شخص کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا ہے۔ (27)

ابن اثیر صاحب نہایہ بھی علّامہ طباطبائیؒ کی طرح، رحمت اور رأفت کے معنی کے منشاءِ فرق کو رحمت کیے جانے والے شخص کے اعتبار سے سمجھتا ہے، لیکن اس زاویئے سے کہ رحمت قبول کرنے والا ممکن ہے کہ رحمت کرنے والے کے نزدیک محبوب یا مبغوض ہو، جبکہ رأفت فقط اُس شخص کے شاملِ حال ہوتی ہے جو رحمت کرنے والے کی نظر میں موردِ محبت ہو۔(28)

جب ہم لفظِ رأفت کے قرآنی استعمال پر نظر کرتے ہیں، تو جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ یہ دو لفظ (رأفت اور رحمت) سوائے ایک مورد کے، ہمیشہ مرکب اور ایک ساتھ ذکر ہوئے ہیں اور یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف معنی رکھتے ہیں، تاکہ اصلِ عقلائی محاورہ و کلامِ عرفی کے خلاف بھی پیش نہ آئے کہ ہر لفظ اپنے جداگانہ معنی پر حمل کیا جائے، خصوصاً یہ کہ ہماری گفتگو کلامِ خداوند حکیم کے بارے میں ہے جو بلاغت و بیان کے عالی ترین مرتبہ اور ہر قسم کے عیب و نقص سے پاک ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ ان دونوں الفاظ کے استعمال کے موارد کا فرق، ان کے معنی کے فرق کی نشاندہی کرتا ہے، کیونکہ صفتِ رأفت، ہمیشہ ایک تعریفی صفت، بلکہ جس طرح کہ پہلے اشارہ ہوا کہ خداوند متعال کے اسمائے حُسنیٰ یا صفتِ پیغمبر اکرم ﷺ اور یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی صفت کے طور پر آئی ہے۔ ماسوائے اس کے کہ فقط ایکبار نکوہش اور مذّمت کے لیے ذکر ہوئی ہے اور وہ حدِّ زنا کے اجراء کا وقت ہے:

"الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔۔۔" (29)

ترجمہ: "زناکار عورت اور زناکار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ اور خبردار دینِ خدا کے معاملہ میں کسی مروّت کا شکار نہ ہو جانا، اگر تمہارا ایمان اللہ اور روزِ آخرت پر ہے۔۔۔"

ظاہر ہے کہ زناکار مرد اور عورت، حدّ کے اجراء کے وقت، مصیبت میں مبتلاء اور گرفتار ہیں، پس اُن کی نسبت مہربانی، رأفت کہی جائے گی، نہ کہ رحمت۔ دوسری جانب یہ کہ قرآنِ کریم نے رأفت کو خداوند متعال کی صفت کے عنوان سے استعمال کیا ہے، اس لیے اس کا دائرۂ کار بہت زیادہ وسیع اور عباد (یعنی تمام بندگان) کے اضافہ کے ساتھ ہے۔ لیکن جب پیغمبر اکرم ﷺ کی صفت واقع ہوا ہے، تو فقط مؤمنین کے ساتھ تخصیص دیا گیا ہے۔

اس اختلاف کے راز کو اس چیز میں تلاش کر سکتے ہیں کہ تمام انسان، اپنی خلقت، عبودیت اور بندگی کے لحاظ سے خداوند متعال کی نسبت برابری اور یکسانیت رکھتے ہیں اور اس پہلو سے سب کے سب انسان اپنے خالق کے محبوب اور عزیز ہیں، پس خداوند متعال اُن کے بارے میں رحمت بھی رکھتا ہے اور رأفت بھی۔ لیکن پیغمبر ﷺ کی نسبت، فقط مؤمنین ہیں جو آنحضرتؐ کے محبوب ہیں، اس بناء پر پیغمبر اکرم ﷺ مؤمنین کے بارے میں رئوف بھی ہیں اور رحیم بھی، لیکن غیرِ مؤمنین کی نسبت، آنحضرتؐ رحیم ہیں، نہ کہ رئوف۔ اس ترتیب کے لحاظ سے رحمت کے معنی کا پھیلاؤ عام ہے جو دوستوں اور غیر دوستوں کو شامل ہوتا ہے، لیکن رأفت فقط، محبوب کے ساتھ لطف و مہربانی کے موردپر صادق آتا ہے۔ یہ جو رسولِ خدا ﷺ، کا تعارف عالمین کے لیے رحمت کے طور پر کرایا گیا ہے، نہ کہ رأفت کے طور پر، شاید اسی لحاظ سے قابلِ فہم ہو۔

قرآن کے دوسرے الفاظ میں سے جو رحمت کے قریب مفہوم رکھتے ہیں، "لینت" اور "مُدارات" کے دو الفاظ کو ذکر کیا جاسکتا ہے۔

۳۔۱۔۳۔ رسول اعظم ﷺ کی رحمت اور رأفت

قرآن کریم مختلف انداز اور گوناگوں تعبیرات کے ساتھ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحمانیت کی تصویر کشی کرتا ہے، کبھی تو آپؐ کو بشریت، بلکہ تمام عالم ہستی کے لیے رحمتِ خالص اور مجسمۂ مہر و محبتِ الٰہی کے عنوان سے ذکر کرتا ہے:

ا۔ "وَما أَرْسَلْناكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعالَمِين" (30)

ترجمہ: "اور ہم نے آپ ﷺ کو عالمین کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

اِس آیتِ مبارکہ کا صحیح معنی و مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ "عالمین" کے معنی اور مقصود کو سمجھیں۔ عالمین، عالَم کی جمع ہے، عالَم یعنی: تمام مخلوقات؛ جوہری "صحاح اللغة" میں بیان کرتا ہے: "اَلعَالَم، اَلخَلْقُ" "عالَم، یعنی تمام مخلوقات" (31) اور نیز اقرب الموارد بیان کرتا ہے: "العَالَم الخَلقُ کُلُّهُ" "عالم، یعنی تمام اور جمیع مخلوقات" (32)

یہ لفظ قرآنِ کریم میں ۷۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے اور ہمیشہ "عالمین" کی صورت میں ہی آیا ہے اور کبھی تو اس سے تمام مخلوقات مراد ہیں، جیسے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعالَمِین" "تمام تعریفیں تمام مخلوقات اور

عالمین کے پروردگار کے لیے ہیں۔" اور کبھی تمام انسان مراد ہیں، جیسے: "۔۔۔ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذاباً لا أُعَذِّبُهُ أَحَداً مِنَ الْعالَمِينَ" (33) "میں اس پر ایسا شدید عذاب نازل کروں گا کہ انسانوں میں سے کسی پر نہیں کیا ہوگا۔" اور کبھی نیز ایک عصرِ واحد کے لوگ یا ایک مملکت اور سرزمینِ خاص کے رہنے والے مراد ہیں، جیسے: "۔۔۔ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعالَمِينَ" (34) "اور میں نے تم کو (اس زمانے یا سرزمین کے) تمام لوگوں پر فضیلت دی ہے۔" اور "وَاصْطَفاكِ عَلى نِساءِ الْعالَمِينَ" (35) "اور (اے مریمؑ) میں نے تمہیں (اس زمانے کی) تمام عورتوں پر فضیلت دی ہے۔"

عالمین کا مفہوم سمجھنے کے لیے کہ کہاں اور کن موارد میں یہ لفظ، تمام مخلوقات کے معنی میں اور کن موارد میں تمام یا بعض انسانوں کے لیے استعمال ہوا ہے، ایک قاعدہ کلّی کے طور پر جس چیز کو قرار دیا جاسکتا ہے وہ اصل اور قاعدہ غالباً یہ ہے کہ جب بھی یہ لفظ (عالمین) صفاتِ الٰہی میں سے کسی ایک صفت کے بعد واقع ہو تو تمام مخلوقات کے معنی میں ہوگا اور اگر کسی ایک شخص یا انسانوں کے گروہِ خاص کی صفت کے عنوان سے استعمال ہوگا تو اس کا مفہوم اور معنی زمان و مکان کی قید و محدودیت کے ساتھ ہوگا۔

اس قاعدے کی بنیاد پر، موردِ بحث آیت (وَما أَرْسَلْناكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعالَمِينَ) میں، عالمین کے معنی کی تشخیص و شناخت، کسی حد تک دشوار اور سخت تر ہو جاتی ہے اور گویا اسی سبب کی وجہ سے ہے کہ قرآن کے مترجمین اور مفسّرین اس آیت کے بارے میں اختلافِ نظر کا شکار ہوئے ہیں، کیونکہ موردِ نظر آیتِ مبارکہ، اس لحاظ سے کہ ایک انسان (پیغمبرِ اکرم ﷺ) کی صفت کو بیان کر رہی ہے، تو ضروری ہے کہ "عالمین" انسانوں کے ایک گروہ۔ جزیرہ نما عربستان کے لوگوں یا پیغمبرِ اکرم ﷺ کے ہم عصر لوگوں۔ کو شامل ہو اور یا حدّ اکثر تمام انسانوں کو شامل ہو؛ اور دوسری طرف کیونکہ پیغمبرِ اکرم ﷺ رحمتِ الٰہی کے عنوان سے توصیف کئے گئے ہیں اور رحمتِ خداوندی کی شان و منزلت، اُس کی دوسری صفات کی طرح، عام اور وسیع ہے (جو سب مخلوقات کو شامل ہے)۔

لٰہذا گزشتہ قاعدۂ کلّی کے پیشِ نظر اور نیز دوسری آیاتِ قرآنی اور روایات کی نصوص کا ملاحظہ کرتے ہوئے کہ جو رسول اکرم ﷺ کا پروردگارِ عالم کی تمام مخلوقات کے لیے وسیع و عریض رحمت کے عنوان سے تعارف کرواتی ہیں، اس آیتِ شریفہ میں بھی "عالمین" تمام مخلوقات کے معنی میں ہے اور رسولِ خدا ﷺ تمام مخلوقات پر خداوند متعال کی رحمتِ خالص ہیں۔

۲۔ "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ" (36)

"اے پیغمبر ﷺ! یہ اللہ کی (برکت اور) مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے، تو یہ لوگ تمہارے پاس سے پراکندہ اور منتشر ہو جاتے، للذا اب انہیں معاف کردو، ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرو اور جب ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

فخر رازی اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں بیان کرتا ہے:

"پیغمبرِ اکرم ﷺ کو مبعوث بہ رسالت کرنے کی غرض یہ ہے کہ آنحضرتؐ تکالیفِ الٰہیہ کو لوگوں تک ابلاغ کریں اور پہنچائیں اور یہ غرض و ہدف اس وقت تک متحقّق نہیں ہو سکتا جب تک کہ لوگوں کے دل پیغمبرِ اکرم ﷺ کی طرف مائل نہ ہوں اور اُن کو آنحضرتؐ کے محضر میں روحانی و نفسانی سکون حاصل نہ ہو۔ اس طرح کے مقصد کے پورا ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ رسولؐ، رحمت، کرامت اور بزرگواری کے مالک ہوں، لوگوں کی خطاؤں اور لغزشوں سے در گزر کریں، اُن کے ناروا اور غیر مناسب سلوک سے چشم پوشی کریں اور اُن کے ساتھ مختلف انداز سے نیک، کریمانہ اور مشفقانہ سلوک روا رکھیں۔

مذکورہ دلیل ہی کہ روشنی میں، پیغمبرِ اکرم ﷺ کے لیے ضروری ہے کہ بداخلاقی اور تُندمزاجی سے مبرّاء اور دور ہوں اور اسی طرح سخت دل اور قسی القلب بھی نہ ہوں، بلکہ کمزوروں کی مدد اور فقیروں کی داد رسی کی طرف بھی زیادہ سے زیادہ مائل ہوں اور اُن کی لغزشوں اور ناروا سلوک سے بھی چشم پوشی کریں۔" (37)

۳۔ "خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ" (سورۂ اعراف، آیت ۱۹۹)

ترجمہ: "آپ عفو کا راستہ اختیار کریں، نیکی کا حکم دیں اور جاہلوں سے کنارہ کشی کریں۔"

علّامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ اس آیتِ مبارکہ سے اپنے فہم اور نتیجہ گیری کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"کسی چیز کے "اَخذ" کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس کا لینے اور اختیار کرنے والا، ہمیشہ اس چیز کو اپنے ساتھ رکھے اور ہرگز ترک نہ کرے؛ اس لحاظ سے عفو و درگزر کا اختیار کرنا، یعنی یہ کہ پیغمبرِ

اکرم ﷺ اپنی نسبت بد رفتاری اور ناروا سلوک کو ہمیشہ پوشیدہ رکھیں (اور در گزر کریں) اور انتقام جوئی سے۔ جو عقلِ اجتماعی کو رُو سے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں جائز شمار کی جاتی ہے۔ چشم پوشی کریں۔

البتہ یہ راہ و رفتار، دوسروں کی خود پیغمبرِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کی نسبت ناروا سلوک روا رکھنے اور اُن کے ذاتی حقوق ضائع کرنے کے لحاظ سے ہے؛ لیکن اگر پیغمبرِ اکرم ﷺ کے ساتھ ناروا سلوک، دوسروں کے حقوق ضائع کرنے کا موجب بنے تو اس مورد میں در گزر کرنا اور بخش دینا ہر گز جائز اور روا نہیں ہے، کیونکہ ایسا عمل، ناروا سلوک روا رکھنے والے شخص کی نسبت گمراہی اور فریب خوری کا پیش خیمہ، دوسروں کے حقوق ضائع ہونے اور معاشرے کو محفوظ اور برقرار رکھنے والے قوانین کے باطل کرنے کا موجب بنے گا۔ وہ تمام قرآنی آیات، جو ظلم و ستم، فتنہ و فساد، ستمگروں کی مدد کرنے اور اُن پر بھروسہ کرنے سے منع کرتی ہیں، اس طرح کی عفو و در گزر کو جائز قرار نہیں دیتی ہیں۔"

علّامہؒ آیت شریفہ کے آخری حصّے "وَأَعْرِضْ عَنِ الْجاهِلِين" کے ذیل میں بیان کرتے ہیں:

"یہ جملہ خداوند متعال کی طرف سے ایک دوسرا دستور العمل ہے، جو ایسے افراد کی نسبت مسالمت اور نرم رویہ اختیار کرنے کے بارے میں ہے جو آنحضرتؐ کے ساتھ ذاتی طور پر ستم روا رکھتے تھے اور یہ جاہلانہ عمل کے آثار محو کرنے اور اُن کے کردار کے فساد کو کم کرنے کے لیے بہترین اور عمدہ ترین روش ہے؛ کیونکہ جاہلانہ عمل کے مقابلے میں مساویانہ انداز کا ردّ عمل، جاہلوں (کی جہالت) کو بڑھاوا دینے اور جاہلانہ سلوک کو ہمیشگی اور دوام دینے کا موجب بنتا ہے۔" (38)

۴۔ "لَقَدْ جاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ ما عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَحِيمٌ" (39)

ترجمہ: "یقینا تمہارے پاس وہ پیغمبرؐ آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اس پر تمہاری ہر مصیبت شاق گزرتی ہے وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں حرص رکھتا ہے اور مومنین کے حال پر شفیق اور مہربان ہے۔"

اِس آیت شریفہ میں قابلِ ملاحظہ نکات میں سے ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ دو ایسی صفات "رؤوف اور رحیم" کہ جو خداوند متعال کی مخصوص صفات میں سے ہیں —کے مالک بیان ہوئے ہیں اور خدائی انداز سے تعریف و ستائش کئے گئے ہیں۔ تمام انسانوں، انبیاءؑ و رسلؑ اور صالحین وغیرہ میں سے فقط پیغمبرِ اکرم ﷺ وہ انسان (کامل) ہیں کہ جن کی ان دو صفات کی ترکیب کے ساتھ توصیف و تمجید کی گئی ہے۔ متونِ روایات اور پیغمبرِ اکرم ﷺ کی سیرت و کردار، کہ جو تعلیماتِ قرآنی کی مکمل تشریح اور آئینہ تمام نما ہیں، آنحضرتؐ کی رأفت، رحمت و مہربانی سے سرشار اور بھرے پڑے ہیں، یہاں ہم دونوں (روایات اور سیرت و کردار) میں سے ہر ایک کے چند نمونے مطلب کی تائید اور مذکورہ آیات کی مزید توضیح کے لیے پیش کرتے ہیں:

۱۔ خود پیغمبرِ اکرم ﷺ سے روایت نقل ہوئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میرے پروردگار نے مجھے لوگوں کے ساتھ نرمی اور ملائمت کا حکم دیا ہے، جیسے کہ واجبات کی انجام دہی کا حکم دیا ہے۔" (40)

۲۔ اَنس بن مالک کہتا ہے: "میں نو سال پیغمبرِ خدا ﷺ کی خدمت اور محضر مبارک میں رہا، مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے مجھ سے یہ کہا ہو کہ تم نے فلاں کام کیوں انجام نہیں دیا؟ اور آپؐ نے کبھی بھی مجھے کسی کام پر سرزنش و ملامت نہیں کی۔" (41)

۳۔ جب پیغمبرِ اکرم ﷺ نے مکہ میں اپنی دعوت کو اعلانیہ طور پر شروع کیا تو مشرکین کی جانب سے شدید ردِّ عمل کا سامنا ہوا اور قریش والوں نے کسی قسم کے اذیت و آزار، شکنجوں، جھوٹ اور توہین آمیز سلوک روا رکھنے سے اجتناب نہ کیا اور آپؐ کو جھوٹا، جادوگر اور دیوانہ شخص کہہ کر پکارتے تھے، لیکن پیغمبرِ اکرم ﷺ کا اِن سب کے مقابلے میں ردِّ عمل یہ تھا کہ آپؐ فرماتے تھے: "پروردگارا! میری قوم کو اپنی رحمت و مغفرت کے سائے میں قرار دے کیونکہ وہ حقیقت کو نہیں جانتے۔" (42)

۴۔ سب سے ممتر، پیغمبرِ اکرم ﷺ کا مکہ والوں کے ساتھ کریمانہ اور مشفقانہ رویّہ، فتح مکہ کے موقع پر، وہاں کا سیاسی اقتدار ہاتھ میں لینے کے وقت مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ جس کا ایک نمونہ، اس فتح مبین کے دن، کہ جب آنحضرتؐ اپنے وطنِ عزیز سے سالوں دور اور آوارۂ وطن رہنے اور آغازِ بعثت کے ایام میں مشرکینِ قریش کی ناروا تہمتوں، سبّ و شتم اور اذیت و آزار کی تلخ یادوں کے ساتھ، پیروزمندانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے اور ہزاروں کا لشکر آپؐ کے ہمراہ موجود تھا، آپؐ اگر اُس وقت چاہتے تو مشرکینِ مکہ اور قریش والوں سے کئی برابر زیادہ اپنا انتقام لے سکتے تھے اور اپنے لشکر کو قتل و غارت گری کا حکم دے سکتے

تھے؛ لیکن پیغمبرِ اکرم ﷺ نے عام معافی کا حکم صادر فرمایا اور سب کی غلطیوں اور ظلم و ستم کو معاف کر دیا، سوائے اُن چند افراد کے، جنھوں نے اپنی باطنی خباثت اور شدّت پسندی کی وجہ سے بخشش اور معافی کی صلاحیت اور شائستگی اپنے ہاتھ سے دے دی تھی اور وہ کفر و الحاد اور ہٹ دھرمی کا پرچم سر بلند کئے ہوئے تھے۔

سعد بن معاذ جو لشکرِ اسلام کے سپہ سالار تھے، اس موقع پر انہوں نے اس مضمون کی رجز خوانی کی:

"آج قتل و غارت گری اور انتقام لینے کا دن ہے، آج تمہاری جان اور تمہارا مال حلال قرار دیا جائے گا۔"

پیغمبرِ اکرم ﷺ سعد کی یہ گفتگو سن کر بہت ناراحت اور غمگیں ہوئے اور اُن کو سپہ سالاری کے منصب سے برطرف کرکے، پرچم اُن کے بیٹے "قلیل بن سعد" کے سپرد کر دیا اور خود آنحضرتؐ نے اُس دن کی توصیف میں فرمایا: "آج کا دن رحمت و مہربانی کا دن ہے۔" پیغمبرِ اکرم ﷺ نے اس رحمت و مہربانی کو عملی طور پر ثابت کرنے کے لیے مکہ والوں سے فرمایا: "جاؤ (آج) تم سب آزاد ہو۔" (43) آنحضرت ﷺ کی اس عفو و در گزر، عطوفت و مہربانی اور وسیع النظری نے مکہ والوں کے دلوں کو موہ لیا اور وہ اسلام اور پیغمبرِ اکرم ﷺ کی دینداری قبول کرنے کی جانب مائل ہونے لگے۔

۵۔ صفوان بن اُمیہ، جو مشرکینِ مکہ کے سرداروں اور پیغمبر ﷺ کے خلاف متعدّد جنگوں کی آگ بھڑکانے والوں میں سرِ فہرست شمار ہوتا تھا اور اُس نے مسلمانوں میں سے ایک شخص کو مسلمان ہونے کے جرم کی پاداش میں مکہ میں موت کے گھاٹ بھی اُتار دیا تھا، اسی وجہ سے وہ اُن چند لوگوں میں شامل تھا جن کو آنحضرتؐ نے معاف نہیں کیا تھا اور اُن کے خون کو حلال اعلان فرمایا تھا، وہ یہ خبر سن کر مکہ سے جدّہ فرار کر گیا؛ لیکن اس کے چچازاد بھائی "عمرو بن وہب" نے پیغمبر ﷺ کے پاس اُس کی سفارش کی اور اُس کی معافی کا مطالبہ کیا۔

رسولِ خدا ﷺ نے اُسے بھی معاف کر دیا۔ جب اُس کو یہ خبر پہنچی تو اُسے یقین نہیں آیا، یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے اپنا عمامہ یا لباس مبارک معافی کی علامت کے طور پر اس کے لیے بھیجا اور جب اُسے معافی کا یقین آگیا تو وہ مکہ لوٹ آیا۔ اُس نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ اُسے دو ماہ کی مہلت دی جائے تاکہ وہ اسلام کے بارے میں تحقیق و جستجو کرے اور اگر نتیجے تک پہنچ گیا تو اسلام قبول کرلے گا۔ پیغمبرِ اکرم ﷺ

نے اُسے چار ماہ کی مہلت دی تا کہ وہ تحقیق کرکے اسلام قبول کرلے۔ صفوان اس واقعے کے بعد کہتا تھا: ”کوئی اس طرح کی نیک سیرت و کردار کا مالک نہیں ہو سکتا، مگر یہ کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا (رسول) ہو، میں شہادت دیتا ہوں کہ خدائے یکتا و واحد کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ (محمدؐ) اللہ کے رسول ہیں۔“ (44)

۴۔ شدّت اور صلابت

۱۔۴۔ صلابت کا مفہوم

ابنِ منظور ”لسان العرب“ میں کہتا ہے: ”صَلبَ الشَّیءُ صَلابَةً فَهُو صَلِیبٌ ... أی شَدیدٌ“ ”صلابت کسی چیز کے استحکام اور شدّت کے معنی میں ہے۔“ ”رَجُلٌ صُلْبٌ وَصَلِبٌ: ذُو صَلابَةٍ“ (45) ”مردِ صُلب، یعنی صاحب صلابت اور شدّت“ جوہری ”صحاح اللغة“ میں ”صَلب“ کو ”سخت زمین“ کے معنی میں سمجھتا ہے۔ (46) اور اسی معنی میں ہے: صُلب (قُفل کے وزن پر)۔

صاحبِ ”قاموس قرآن“ کہتا ہے: ”هُوَصُلْبٌ فِی دِینِهِ“ (47) ”وہ اپنے دین میں محکم اور استوار ہے۔“ نہج البلاغہ میں امام علی علیہ السلام کے پینتالیسویں (۴۵) خط میں بھی آیا ہے: ”أَلَا وَإِنَّ الشَّجَرَةَ الْبَرِّیَّةَ أَصْلَبُ عُوداً“ ”جان لو! کہ صحرائی درخت (جو طوفانوں کے معرض اور پانی کی کمی سے دُچار ہے) مضبوط اور محکم تر ہے۔“ اِس لفظ کے قرآنی استعمال میں بھی استحکام اور سختی و شدّت کا معنی پوشیدہ ہے۔ اِس آیت مبارکہ: ”خُلِقَ مِنْ ماءٍ دافِقٍ یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرائِبِ“ (48) یعنی: ”وہ ایک اُچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔“ میں ”صُلب“ کمر کی ریڑھ کی ہڈیوں (مہروں) کے معنی میں ہے، جو مرد کا نطفہ جاری ہونے کا مقام ہے۔ راغب اس نام گذاری کی علّت یہ بیان کرتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈیوں کے مہرے سخت ہوتے ہیں۔ نیز اسی طرح ”صُلب“ کا معنی اور مفہوم اس آیت مبارکہ میں ہے: ”۔۔۔ وَحَلائِلُ أَبْنائِكُمُ الَّذِینَ مِنْ أَصْلابِكُمْ۔۔۔“ (49) یعنی: ”اور تمہارے فرزندوں کی بیویاں، جو فرزند تمہاری صُلب (پشت) سے ہیں (تم پر حرام کی گئی ہیں)۔۔۔“

نتیجہ: لفظِ صلابت، استحکام، شدّت، استقامت اور پائیداری کے معنی میں ہے اور اس کے ساتھ کسی چیز، جیسے: دین، عقیدہ، رائے وغیرہ کے اضافہ کرنے سے یہ لفظ اُس چیز کے استحکام اور صلابت و پائیداری کو بیان کرتا ہے، اِس لحاظ سے یہ لفظ منفی اور مذموم معنی کا حامل نہیں ہے؛ بلکہ اکثر موارد میں عمدہ اور

پسندیدہ صفت کے عنوان سے شمار ہوتا ہے، جیسے: "رَجُلٌ صُلبٌ" "استوار اور پائیدار شخص" یا "صُلبٌ فی دِینِهِ" "وہ اپنے دین اور آئین میں مستحکم اور پائیدار ہے" یا "شَجرۃٌ صُلبۃٌ" "مضبوط اور مستحکم درخت" جیسا کہ امام علی علیہ السلام اپنے سابقہ خط میں، صحرائی درخت کی پانی کے کنارے موجود درخت پر برتری اور تعریف کرتے ہوئے، صحرائی درخت کو صلابت اور استحکام کے ساتھ سراہتے ہیں؛ جبکہ نہروں اور دریاؤں کے کنارے اُگنے والے درخت اس قدر استحکام و پائیداری اور تعریف کے حامل نہیں ہوتے ہیں۔

۲۔۴۔ صلابت اور غلظت کے مفہوم میں فرق

صلابت اور غلظت دو ایسے الفاظ ہیں، جو مفہوم اور معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے نزدیک ہیں، لیکن معنی کی خصوصیت، کہ جسے ہم نے پہلے صلابت کے مورد میں بیان کیا۔ یعنی تعریفی اور مثبت ہونا۔ کے لحاظ سے صلابت اور غلظت کے درمیان فرق ہے، کیونکہ باوجود اس کے کہ غلظت بھی شدّت اور سختی کے معنی میں ہے: "غَلَظَ الشَیءُ: اِشْتَدَّ وَقَوِیَ وَصُعبَ" (50) "شیء غلیظ ہو گئی، کا معنی یہ ہے کہ مستحکم، قوی اور سخت ہو گئی۔" اس لحاظ سے غلظت، صلابت کے ہم معنی و مفہوم ہے، لیکن زیادہ تر موارد میں "غلظت" منفی معنی کا حامل ہے، جیسے: "عَذابٌ غَلِیظٌ" "یعنی: سخت اور دردناک عذاب" یا "۔۔۔ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۔۔۔" (51) یعنی: "اور اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے پراکندہ اور منتشر ہو جاتے۔" یا "...عَلَيْها مَلائِكَةٌ غِلاظٌ شِدادٌ..." (52) یعنی: "جس (آگ) پر وہ فرشتے معین ہوں گے جو سخت مزاج، تند و تیز اور طاقتور ہیں۔۔۔"

بعض موارد میں غلظت بھی اسی صُلب اور استحکام کے معنی کو ادا کرتا ہے، جیسے: "... فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوى عَلى سُوقِه..." (53) یعنی: "... پھر اسے مضبوط بنائے (اور وہ موٹی ہو جائے اور) پھر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے..." یا "... وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً..." (54) یعنی: "اور ضروری ہے کہ وہ تم (مومنین) میں سختی اور طاقت کا احساس کریں..."

صلابت اور غلظت کے معانی کے درمیان اسی فرق کا ماحصل یہ ہے کہ لفظِ "لین" "یعنی: نرمی اور خوش خلقی" غلظت کے مقابل میں قرار پاتا ہے، نہ کہ لفظِ صلابت کے، جیسا کہ سورۂ مبارکہ آل عمران کی آیت

۱۵۹ میں خداوند متعال نے لین یعنی نرم ہونے کو پیغمبرِ اکرم کی صفات میں شمار اور غلیظ و درشت ہونے کو آنحضرتؐ کی جناب سے نفی کیا ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ۔۔۔"

ترجمہ: "اے پیغمبر ﷺ! یہ اللہ کی (برکت اور) مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے پراکندہ اور منتشر ہو جاتے۔۔۔"

۳۔۴۔ رسول اعظم ﷺ کی شدّت اور صلابت

اس سے پہلے کہ ہم رسولِ خدا ﷺ کی صلابت اور قاطعیت کے بارے میں گفتگو کریں، چند نکات قابلِ ملاحظہ ہیں:

۱۔ صلابت، شدّت اور سخت گیری کے مفہوم میں، قاطعیت، ثابت قدمی، شدّت پسندی اور تُندروئی کے الفاظ کے ساتھ نزدیک اور ہم معنی ہے، اگرچہ براہ راست اور صراحت کے ساتھ "صلابت" اور اس کے ہم معانی الفاظ، دینی و قرآنی نصوص و متون میں، اخلاقی، روحانی اور نفسانی صفات کو بیان کرنے کے لیے کم ہی استعمال ہوئے ہیں؛ لیکن دوسری تعبیرات کے انداز میں، جیسے: تُندروئی، شدّت پسندی، قاطعیت اور تسلیم نہ ہونے یا پھر ایسی عبارات اور جملوں کی صورت میں بیان ہوئے ہیں کہ ان کا مضمون اور مفہوم، صلابت اور شدّت کو اوصافِ فضیلت میں سے ایک فضیلت کے عنوان سے بیان کرتا ہے اور اس صفت کو رسولِ خدا ﷺ کے اخلاقی فضائل میں سے قرار دیتا ہے اور تعریف کرتا ہے۔

۲۔ ہر انسان، بالخصوص اجتماعی اور سیاسی پیشواؤں اور رہنماؤں کی زندگی میں، کبھی صلابت و قاطعیت اور شدّت پسندی، نہ صرف یہ کہ شائستہ اور اچھی چیز ہے، بلکہ اس کی ضرورت ناگزیر اور لازمی ہے۔ اگر خطا کاروں، گناہگاروں اور نیز معاشرے یا ایک قلمروئے فکری میں موجود قانون شکن اور جرائم پیشہ افراد کے ساتھ سخت گیری اور قاطعیت و صلابت کا سلوک روا نہ رکھا جائے، تو یہ خطاکار اور جرائم پیشہ افراد، احساسِ اَمنیت کریں گے اور معاشرے کا عمومی ماحول، خوف و وحشت اور ناامنی کا شکار ہو کر سب کے لیے آرام و آسائش سلب ہونے کا موجب بن جائے گا اور گڑبڑ سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، جیسا کہ

بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں سخت اور قاطعانہ رویّہ نہ ہونے کی وجہ سے، استعمار گران اور تجاوز کنندگان، اقتدار و حاکمیتِ ملّی اور نیز استقلال و استحکام مملکت کو اپنے قدموں تلے روند ڈالتے ہیں۔
اسی وجہ سے ہے کہ عقل و خردِ انسانی اور نیز شریعت اسلامی، صلابت اور قاطعیت کو بہت سے موارد میں ضروری، لازم اور جائز شمار کرتی ہیں اور نیز معاشرے کے راہنماؤں اور رہبروں کے لیے صلابت و قاطعیت کے ہونے کو اُن کے اس مقام اور منصب کی شائستگی اور ضروری صلاحیت کے طور پر جانا گیا ہے۔
اس لحاظ سے پیغمبرِ اکرم ﷺ لوگوں کے ساتھ کمالِ رأفت و مہربانی کے مالک ہونے کے باوجود، دشمنانِ اسلام اور مخالفانِ حق کے مقابلے میں شدّت و صلابت، قاطعیت اور سخت برخورد میں بھی کمال رکھتے تھے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپؐ تمام انسانی کمالات کا نمونہ اور اُسوہ قرار نہ پاتے۔

۳۔ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی شدّت و صلابت اور قاطعیت کی حدود بالکل مشخّص اور معیّن تھیں:

ایک: حدود اور احکامِ الٰہی کے اجراء اور نفاذ کا مقام

دوسرا: کافر اور ہٹ دھرم مشرکین کے ساتھ، کہ جو حق کو، حقیقت سے ناآگاہی اور عدمِ شناخت کی بناء پر نہیں، بلکہ حق و حقیقت سے دشمنی اور عداوت کی بناء پر قبول نہیں کرتے تھے اور نیز منافقین، مجرمین اور گناہگار لوگ، چاہے وہ مسلمانوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوں اور انہوں نے ظاہری طور پر اسلام کا لبادہ اُوڑھا ہوا ہو۔قرآنی آیات کے چند نمونے، جو رسولِ اعظمِ اسلام ﷺ کی شدّت و صلابت اور قاطعیت کی بیان کرتی ہیں:

ا۔"فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ۔۔۔" (55)

ترجمہ: "پھر جب یہ محترم مہینے گزر جائیں تو کفّار کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور گرفت میں لے لو اور قید کر دو اور ہر راستہ اور گزرگاہ پر ان کے لئے بیٹھ جاؤ اور راستہ تنگ کر دو۔۔۔"

جیسا کہ ظاہر ہے یہ آیتِ مبارکہ، مشرکین کے ساتھ سخت ترین موضع گیری اور قاطعانہ رویّہ اختیار کرنے کا اعلان کرتی ہے، اسی سورہ کی اس آیت سے پچھلی آیات یا قرآنِ کریم کی دوسری سورتوں کی وہ آیات، جو اس موضوع کے ساتھ مربوط ہیں، اگر اُن میں تأمّل اور غور و فکر کیا جائے تو واضح اور مشخّص ہو جاتا ہے کہ

اس طرح کا سخت اور شدید دستور العمل، مسلمانوں اور پیغمبرِ اکرم ﷺ کے ساتھ ہم پیمان مشرکین کی پیمان شکنی اور وعدہ خلافی کے بعد دیا گیا ہے۔

علّامہ طباطبائیؒ سورۂ مبارکۂ توبہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں، کہ جن میں رسمی اور اعلانیہ طور پر مشرکین سے بیزاری کا اظہار ہوا ہے، فرماتے ہیں: ”ان آیاتِ مبارکہ سے مقصود، اُن مشرکین کے ساتھ اَمن کا معاہدہ ختم ہونے کا اعلان ہے کہ جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا تھا (اور بعد میں یہ معاہدہ توڑ ڈالا)، یہ (معاہدہ ختم ہونے کا) اعلان بغیر کسی سبب اور وجہ کے صادر نہیں ہوا، کیونکہ خداوند متعال بعد میں آنے والی متعدّد آیات میں بیان کرتا ہے کہ مشرکین کے اس عہد و پیمان پر ہرگز کوئی اطمینان و اعتماد نہیں ہے، بالخصوص یہ کہ بہت سے مشرکین نے پیمان کی رُو سے روگردانی کی اور انہوں نے پیمان کی حُرمت کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ اگر اس عہد و پیمان کا ایک طرفہ اور وہ بھی مسلمانوں کی وجہ سے باطل کرنا، مشرکین کی طرف سے بغیر کسی تخلّف اور علّت کے ہوتا، تو کوئی دلیل اور وجہ نہیں تھی کہ قرآنِ کریم مشرکین کے دو گروہوں (وہ جو اپنے عہد و پیمان پر وفادار رہے اور وہ جنہوں نے اپنے عہد و پیمان سے روگردانی کی اور پیمان توڑ ڈالا) کے درمیان فرق قرار دیتا اور کہتا: وہ جنہوں نے عہد و پیمان شکنی کی، وہ حکمِ برائت سے مستثنیٰ ہیں:

”إِلَّا الَّذِينَ عاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئاً وَلَمْ يُظاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَداً فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ“ (56)

ترجمہ: ”علاوہ ان افراد کے جن سے تم مسلمانوں نے معاہدہ کر رکھا ہے اور انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور تمہارے خلاف ایک دوسرے کی مدد نہیں کی ہے تو چار مہینے کے بجائے جو مدّت طے کی ہے اس وقت تک عہد کو پورا کرو کہ خدا تقویٰ اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

پس آیتِ مبارکہ کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین کا وہ گروہ، جو مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان رکھتا تھا، یہ آیت اُن کے ساتھ عہد و پیمان کے باطل ہونے اور اَمان کے برطرف ہونے کا اعلان کرتی ہے، کیونکہ اُن میں سے اکثر نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ ڈالا اور یہی چیز سبب بنی کہ اُن تھوڑے سے لوگوں کی نسبت، جو ابھی تک اپنے عہد و پیمان کے ساتھ وفادار تھے، اعتماد و اطمینان باقی نہ رہے اور اُن کی طرف سے بھی اسلام کے خلاف شرارتوں اور نیرنگ بازیوں سے اَمنیت کا احساس باقی نہ رہ سکے۔“ (57)

۲۔ "فَلا تُطِعِ الْكافِرينَ وَجاهِدْهُمْ بِهِ جِهاداً كَبِيراً" (58)

ترجمہ: "لہٰذا آپؐ کافروں کے کہنے میں نہ آئیں اور ان سے آخر دم تک جہاد کرتے رہیں۔"

۳۔ "يا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللهَ وَلا تُطِعِ الْكافِرِينَ وَالْمُنافِقِين۔۔۔" (59)

ترجمہ: "اے پیغمبر ﷺ! خدا سے ڈرتے رہیئے اور خبر دار کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجئے۔۔۔"

اس آیت مبارکہ میں کافروں اور منافقوں کے مقابلے میں صلابت اور قاطعیت اختیار کرنے کی دعوت سے پہلے، تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنے کی ضرورت پر یادآوری، کا معنی یہ ہے کہ قاطعیت اور صلابت بھی تقوائے الٰہی کے مصادیق میں سے ہے۔

۴۔ "فَلا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ * وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُون * وَلا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَهِينٍ" (60)

ترجمہ: "لہٰذا آپؐ جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کریں، یہ چاہتے ہیں کہ آپؐ ذرا نرم ہو جائیں تو یہ بھی نرم ہو جائیں اور خبر دار آپؐ کسی بھی مسلسل قسم کھانے والے ذلیل کی اطاعت نہ کریں۔"

شہید مرتضیٰ مطہریؒ اس آیتِ مبارکہ کے مفہوم اور مقصود کو اس طرح توضیح دیتے ہیں: "اس آیت کا موضوع "ادھان" یعنی تساہُل و تسامُح اختیار کرنا" ہے اور یہ "ادھان" یعنی سہل گیری اور نرم رویّہ اختیار کرنا دو طرفہ ہے؛تدھن: اپنی گفتگو میں تھوڑا نرمی سے کام لو تاکہ ہم بھی اپنی گفتار میں نرمی لائیں، یعنی تساہُل اور آسان رویّہ اختیار کرنا۔ آجکل ایک اور اصطلاح وجود میں آئی ہے جس کا نام رکھا ہے "تسامُح" اگرچہ "تسامُح" اپنے معنیٰ کی حد تک اچھی تعبیر ہے لیکن انہوں نے اس کا نام رکھا ہے، تسامُح دینی، تاکہ تساہُل و سہل گیریِ دینی کا تعصّب دینی کے مقابلے میں دفاع کریں، ۔۔۔ قرآنِ کریم اس کی شدّت کے ساتھ نفی و تردید فرماتا ہے: "فَلا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ۔۔۔" (61)

پھر شہید مطہریؒ تسامُح کو ممدوح اور مذموم دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں اور ان کے فرق کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"وہ مطلب جس کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہی مسئلہ تساہُل و تسامُح ہے، کیا قرآنِ کریم اس کام کی بطورِ کلّی نفی کرتا ہے؟ ضروری ہے کہ میں عرض کروں کہ یہاں دو مطلب ہیں: ایک قسم کی قرآنِ کریم بطورِ کلّی نفی کرتا ہے اور پیغمبرِ اکرم ﷺ کو ہرگز اجازت نہیں دیتا، کجا برسد کہ غیرِ پیغمبرؐ ہو، اور وہ (یعنی) آئندہ کے پروگرام اور طرزِ تفکّر کی اساس اور بنیاد پر مصالحت و صلح کرنا، یعنی: آج کل کی

اصطلاح میں آئیڈیالوجی۔ یعنی: آئیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مصالحت اور توافق کریں کہ تم اپنی بعض باتوں سے صرفِ نظر کرو، ہم بھی اپنی بعض باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ ایک دینِ حق، محال ہے اس طرح دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے اور کنارہ گیری اختیار کرنے کی اجازت دے... حتی کہ ایک مستحب یا مکروہ کام بھی مصالحت اور در گزر کے قابل نہیں ہے۔ ایک چیز جو وحیِ الٰہی کا جزء ہے، چاہے معمولی مکروہ کے عنوان سے، مصالحت کے قابل نہیں ہے۔

بلکہ ایک دوسرا امر (کام) ہے جو مصالحت اور در گزر کے قابل ہے اور اصطلاحی طور پر ٹیکنیک اور چارہ جوئی کے قابل ہے۔ مصالحت و صلح، ٹیکنیک کے مسئلہ سے مربوط ہے، اصول کے ساتھ ٹیکنیک اور چارہ جوئی کا مسئلہ، یعنی خود لائحہ عمل (پروگرام) کے مواد اور محتوا میں ہرگز جاری نہیں ہوتا، بلکہ میدانِ عمل میں جاری ہوتا ہے، یعنی کسی کام کے اجراء و نفاذ کے موقع پر یہ معاہدہ کریں کہ اس کام کو فعلاً (وقتی طور پر) مقدّم یا موٴخّر کر دیں گے۔۔۔ قرآنِ کریم نے پیغمبرِ اکرم ﷺ سے یہ اختیار سلب نہیں کیا ہے کہ آنحضرتؐ مشرکین کے ساتھ ایک قرار دادِ مصالحت کے اجراء کرنے کے مقام پر امضاء نہ کریں اور نہ ہی اپنے نزاع اور جھگڑوں میں صلح کریں۔" (62)

۵۔ "وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ"

ترجمہ: "اور اللہ نے اُن تینوں پر بھی رحم کیا جو (جنگِ تبوک میں) جہاد سے پیچھے رہ گئے (اور مسلمانوں نے اُن کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیے) یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعتوں سمیت اُن پر تنگ ہو گئی اور اُن کی دَم پر بن گئی اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب اللہ کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے، تو اللہ نے اُن کی طرف توجہ فرمائی کہ وہ توبہ کر لیں اس لئے کہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔" (63)

یہ آیتِ شریفہ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی اُن تین مسلمانوں کے ساتھ قاطع، شدید اور باصلابت رفتار کی حکایت کرتی ہے کہ جنھوں نے غزوۂ تبوک میں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے میں شرکت سے روگردانی اختیار کی۔ جب آنحضرتؐ جنگ کے بعد مدینہ لوٹ کر آئے اور یہ تینوں افراد آپؐ کے حضور شرفیاب ہوئے تاکہ اپنی طرف سے عذر اور بہانہ تراشی کر سکیں تو پیغمبرِ اکرم ﷺ نے اُن سے کوئی کلام نہ کیا اور دوسرے

مسلمانوں کو بھی حکم دیا کہ ان کے ساتھ بات نہ کریں، یہ فرمانِ نبویؐ باعث بنا کہ ان کی بیویاں اور بچّے آنحضرتؐ کے محضر میں آئیں اور ان سے جدائی کا مطالبہ کریں! شہرِ مدینہ کا عمومی ماحول ان تینوں پر اس قدر تنگ و دشوار ہوگیا کہ ناچار انہوں نے مدینہ چھوڑ دیا اور اطراف کے پہاڑوں میں پناہ لے لی۔ ایک طویل مدّت (چالیس سے زائد روز یا ایک قول کے مطابق ایک سال) تک وہ پہاڑوں میں خدا سے راز و نیاز، تضرُّع و زاری اور توبہ و استغفار میں مشغول رہے، یہاں تک کہ خداوند متعال نے ان کی توبہ قبول کی اور یہ آیتِ مبارکہ نازل فرمائی! یہ موقع تھا کہ پیغمبرِ اکرم ﷺ نے ان کو معاف کر دیا اور وہ اپنے گھروں اور مسلمانوں کی محافل میں داخل ہونے کے قابل ہوئے۔(64)

۶۔"مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُم۔۔۔" (65)

ترجمہ: "محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحمدل ہیں۔۔۔"

رحمت اور صلابت و قاطعیت (مومنین کے ساتھ رحمت، رأفت و مہربانی اور کافروں و مشرکوں کے ساتھ صلابت و قاطعیت) کا اکٹھے ذکر کرنا، اس لحاظ سے ہے کہ یہ دونوں فضیلتیں؛ نہ صرف یہ کہ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی اجتماعی و معاشرتی راہ و رفتار کی عمدہ ترین صفات اور خصلتیں ہیں، بلکہ آپؐ پر ایمان لانے والے آپؐ کے پیروکاروں کے لیے بھی عمدہ ترین اخلاقی و معاشرتی صفات اور نمونۂ عمل کے لیے واضح معیار و میزان ہیں، البتہ اس طرح کی ارزش مندی، رحمت و رأفت کی نسبت ذہن سے قریب تر ہے، لیکن شدّت و صلابت کے بارے میں، اگر قرآنِ کریم کی وحیانی سفارشات نہ ہوتیں، تو کسی قدر عجیب و غیرِ قابلِ قبول لگتیں، جبکہ قرآنِ کریم کی آسمانی والٰہی تعلیمات، پیغمبرِ اکرم ﷺ کی شخصیت کو گویا اس سبب سے خُلقِ عظیم کا مالک سمجھتی ہیں کہ آپؐ رحمت و صلابت کا مکمل پیکر اور نمونۂ عمل ہیں۔ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے، قرآنِ کریم کی اُن وحیانی آیات کا فقط ایک نمونہ ہے جو رسولِ خدا ﷺ کی قاطعیت و صلابت کو بیان کرتی ہیں۔

۴۔۴۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی قاطعیت کے تاریخی نمونے

سیرتِ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی تاریخ، جو در حقیقت اُنہی گزشتہ قرآنی تعلیمات کا پیغمبرؐ کے عمل اور راہ و رفتار میں جلوہ نما ہونا ہے، آپؐ کے قاطعانہ اور باصلابت عملی نمونوں کو واضح اور آشکارا کرتی ہے:

۱۔ فاطمہ مخزومی نامی اشرافِ قریش کی ایک عورت جب چوری کی مرتکب ہوئی تو رسولِ خدا ﷺ نے اس کے بارے میں الٰہی حد جاری کرنے کا حکم فرمایا، قبیلہ بنی مخزوم اس حکم سے ناراحت ہوئے اور انہوں نے کوشش کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اجرائے حد کو روکیں، حتیٰ کہ اُسامہ بن زید نے، جو کہ آنحضرت ﷺ کے نزدیک محبوب اشخاص میں سے تھا، جب آپؐ سے بخشش کا تقاضا کیا، تو آپؐ اس درخواست سے سخت ناراحت ہوئے اور فرمایا: "آیا تم حدودِ الٰہی میں سے ایک حد کے (جاری ہونے کے) بارے میں شفاعت کرتے ہو؟!" پھر آپؐ اپنی مقام سے کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، جس کا کچھ حصّہ یہ تھا:

"اے لوگو! تم سے پہلے والی اُمتّوں کے ہلاک ہونے کہ وجہ یہ تھی کہ اگر اُن میں سے کوئی بلند مرتبہ شخص کسی جُرم کا ارتکاب کرتا تھا تو وہ اس کو مجازات نہیں کرتے تھے لیکن اگر ضعیف و ناتوان اور اجنبی شخص کوئی گناہ کرتا تھا تو اس کے بارے میں حکمِ خدا جاری کرتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر (برفرضِ محال) میری بیٹی فاطمہؑ بھی اس طرح کا کوئی کام کرے تو میں اس کے بارے میں بھی حکمِ خدا جاری کروں گا اور حکم و قانونِ خدا کے سامنے فاطمہ مخزومی اور فاطمہ محمدیؑ یکساں ہیں۔" (66)

احکام اور حدودِ الٰہی کے اجراء میں صلابت و قاطعیت، اس لحاظ سے ضروری، پسندیدہ اور اخلاقی فضیلت کے طور پر شمار ہوتی ہے کہ اس مورد میں سُستی و غفلت، اجتماعی زندگی کی بنیادیں کمزور کرنے، جُرم و جنایات کے بڑھنے، عمومی حُرمت و عفّت کے پائمال ہونے، ارزشمند چیزوں کے بے ارزش ہونے اور اخلاقی و اعتقادی اوصاف کے ناپید و کمیاب ہونے کا باعث بنتی ہے کہ کوئی بھی اندیشمند اور عقلمند اس طرح کی نرمی، مصالحت اور مسالمت کو بعد میں آنے والی ذلّت و نکبت اور رسوائی و خواری کے مقابلے میں قبول نہیں کرتا۔

۲۔ غزوۂ تبوک کے بعد، جو ہجرت کے نویں سال پیش آیا، قبیلۂ ہوازن کے کچھ نمائندہ افراد نے اپنے قبیلے کے اسلام قبول کرنے کے لیے اپنے تمایل کا اظہار کیا اور اس کام کے لیے پہلے کچھ شرطیں معیّن کیں، جن میں سے ایک شرط یہ تھی کہ وہ لوگ (ایک سال تک) نماز پڑھنے سے معاف رہیں گے! لیکن پیغمبرِ اکرم ﷺ نے پوری قاطعیت و صلابت کے ساتھ اس شرط کے مقابلے میں استقامت فرمائی، باوجود اس کے کہ آپؐ کی شدید خواہش تھی کہ ایک ایک فرد ایمان لے آئے۔ کہاں یہ کہ ایک پورا قبیلہ مسلمان ہو جائے۔ آپؐ نے اُن کی اس شرط کو ٹھکرا دیا اور فرمایا: "وہ دین جس میں نماز نہ ہو اُس میں کوئی خیر و بھلائی نہیں ہے۔" (67)

حوالہ جات

1۔ سورۂ جمعہ، آیت ۲

2۔ سورۂ مریم، آیت ۴۱

3۔ سورۂ مریم، آیت ۵۱

4۔ سورۂ مریم، آیت ۵۴

5۔ سورۂ ص، آیت ۴۵

6۔ سورۂ ص، آیت ۴۸

7۔ سورۂ مریم، آیت ۵۶

8۔ سورۂ ص، آیت ۱۷

9۔ سورۂ ص، آیت ۴۱

10۔ سورۂ ممتحنہ، آیت ۴

11۔ سورۂ احزاب، آیت ۲۱

12۔ مغنیہ، محمد الجواد، التفسیر الکاشف، ۱۹۸۱ء، ج ۷، ص ۳۸۷

13۔ زمخشری، محمود الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل و عیون الا قاویل فی وجوہ التأویل، ج ۳، ص ۵۳۱

14۔ سیوطی، عبد الرحمان، الاتقان فی علوم القرآن، تحقیق: ڈاکٹر محمد ابوالفضل ابراہیم، ج ۲، ص ۲۵۶

15۔ سابقہ حوالہ

16۔ زمخشری، تفسیر الکشاف، ج ۴، ص ۵۱۴

17۔ سورۂ اسراء، آیت ۹

18۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹

19۔ لسان العرب، مادہ رحمت۔

20۔ المفردات فی غریب القرآن، مادۂ رحمت

21۔ زمخشری، تفسیر الکشاف، ج ۱، ص ۸

22۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۱۸

23۔ الامام علیؑ، نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۷

24۔ صحاح اللغہ، مادۂ رأفت

25۔ اقرب الموارد، مادۂ رأفت

26۔ قرشی، سید علی اکبر، قاموس القرآن، مادۂ رأفت

27۔ طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ج۱، ص۱۸

28۔ النھایۃ، مادۂ رأفت

29۔ سورۂ نور، آیت ۲

30۔ سورۂ انبیاء، آیت ۱۰۷

31۔ صحاح اللغہ، مادۂ عالم

32۔ سعید شرتونی لبنانی، اقرب الموارد، مادۂ عالم

33۔ سورۂ مائدہ، آیت ۱۱۵

34۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۲

35۔ سورۂ آل عمران، آیت ۴۲

36۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹

37۔ فخر رازی، محمد بن عمر، التفسیر الکبیر، ج۹، ص۶۲

38۔ طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ج۹، ص ۶۴

39۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۲۸

40۔ الاصول من الکافی، ج۲، ص۱۱۷، حدیث ۴

41۔ طبرسیؒ، مکارم الاخلاق، ص۱۶

42۔ مجلسیؒ، محمد باقر، بحار الانوار، ج۹۸، ص۱۶۷

43۔ ابنِ جریر طبری، محمد، تاریخِ طبری، ج۳، ص۵۶؛ سبحانی، جعفر، فروغِ ابدیت، ج۲، ص۷۳۶؛ سیرہ ابنِ ہشام، ج۴، ص۷۴۳

44۔ سابقہ حوالہ جات

45۔ لسان العرب، مادۂ صُلب

46۔ صحاح اللغہ، مادۂ صُلب

47۔ قاموس القرآن، مادۂ صُلب

48۔ سورۂ طارق، آیت ۶-۷
49۔ سورۂ نساء، آیت ۲۳
50۔ قاموس القرآن، مادۂ غلظ
51۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹
52۔ سورۂ تحریم، آیت ۶
53۔ سورۂ فتح، آیت ۲۹
54۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۲۳
55۔ سورۂ توبہ، آیت ۵
56۔ سورۂ توبہ، آیت ۴
57۔ تفسیر المیزان، ج ۹، ص ۱۴۷
58۔ سورۂ فرقان، آیت ۵۲
59۔ سورۂ احزاب، آیت ۱
60۔ سورۂ قلم، آیت ۸-۱۰
61۔ مطہری، مرتضیٰ، تعلیم وتربیت، ص ۱۶۷
62۔ سابقہ حوالہ
63۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۱۸
64۔ فروغِ ابدیت، ج ۲، ص ۹۷
65۔ سورۂ فتح، آیت ۲۹
66۔ السیرۃ النبویۃ، ابنِ ہشام، ج ۴، ص ۸۵
67۔ سابقہ حوالہ